علامہ اقبال

اقبال نے شاعری کی دنیا میں قدم رکھا تو ہر طرف غزل کی گرم بازاری تھی اور داغ وامیر کا رنگِ سخن مقبولِ خاص وعام تھا۔ اقبال بھی غزل کی طرف متوجہ ہوئے اور عام طرزِ سخن کو اختیار کیا۔ اس وقت اقبال کم عمر تھے اور ابھی میٹرک کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا لیکن دوستوں اور بزرگوں کے اصرار پر مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے تھے۔ لاہور کے ایک مشاعرے میں اس شعر پر بہت داد ملی ——

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے

داد وتحسین نے حوصلہ بڑھایا اور وہ باقاعدگی سے فکرِ سخن کرنے لگے۔ کسی مشہور استاد کی شاگردی اختیار کرنا اس زمانے کا عام دستور تھا۔ استاد داغ دہلوی نے حیدرآباد میں اصلاحِ سخن کا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ شعرا کا کلام ڈاک سے موصول ہوتا تھا اور اصلاح کے بعد واپس کر دیا جاتا تھا۔ اقبال داغ کے نادیدہ پرستار تھے۔ ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ اسی زمانے کے ایک مصرعے میں اس رشتے پر فخر کا اظہار کیا ہے ——

مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

اس زمانے کے کلام سے داغ کی مکمل پیروی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعد کو جب بانگِ درا کی ترتیب کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے کلام پر نظر ڈالی اور بہت سی غزلوں کو اس مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ دو ایک غزلیں شاید نمونے کے طور پر انتخاب کر لی گئیں۔ ان میں سے ایک غزل کے چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں ——

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمھارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

Scanned by TapScanner

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد — مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا — فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

اس غزل کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شاعر نے اپنے استاد کی پیروی میں جھوٹے عشق کی جھوٹی باتیں بیان کی ہیں جو تاثیر سے بالکل خالی ہیں۔ ساری توجہ لطفِ بیان پر ہے۔ مگر یہ اقبال کا اصلی رنگ نہیں۔ اقبال کی شاعری کے اس دور کو محض مشق کا دور کہنا مناسب ہوگا۔

اس کے بعد اقبال کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ کچھ تو والد کی وصیت نے اور کچھ حالاتِ زمانہ کے تقاضے نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ملت کی بہتری اور اسے تباہی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے کوئی مفید کام کرنا چاہیے۔ اس وقت اردو کی روایتی عشقیہ شاعری انھیں تضیعِ اوقات معلوم ہونے لگی اور انھوں نے شعر گوئی ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر کار سر عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ کے سمجھانے پر انھوں نے اپنا فیصلہ تو رد کر دیا لیکن یہ تہیہ کر لیا کہ اب ان کی شاعری کا مقصد ہوگا قوم کو بیدار کرنا اور مردہ دلوں میں جان ڈالنا۔ چنانچہ داغ کا رنگِ شاعری اب ان کے لیے بے مصرف تھا۔ اس سے انھوں نے کنارا کر لیا۔ اور غالب کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ وہ شاعری سے جو کام لینا چاہتے تھے اس میں غالب کا اسلوب ہی معاون ہو سکتا تھا۔ غالب کا فلسفیانہ اندازِ بیان اور فارسی تراکیب اقبال کے کلام میں جلوہ گر ہونے لگیں۔ اس لیے کہا گیا اور درست کہا گیا کہ غالب نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے۔ سر عبدالقادر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اقبال کے روپ میں غالب نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ لیکن غالب و اقبال میں ایک نمایاں فرق ہے۔ غالب فلسفی نہیں البتہ حکیمانہ نظر رکھتے ہیں۔ جب کہ اقبال فلسفی ہیں اور ایک مربوط فلسفہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے دونوں کے فرق کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے :-

"غالب نے اپنے آپ کو کسی مخصوص مقصد یا نقطۂ نظر کا پابند نہیں رکھا تھا۔ وہ جو چاہتے تھے کہہ سکتے تھے۔ اقبال اپنے سامنے ایک مقصد رکھتے تھے جس سے وہ ہم کو آشنا کرانا چاہتے تھے۔"

بانگ درا اقبال کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں دونوں طرح کی غزلیں شامل ہیں۔ وہ بھی جو انھوں نے روایتی انداز میں کہیں اور وہ بھی جو ان کی شاعری کی نئی سمت کا پتا دیتی ہیں۔ اب ان کی غزل کا انداز یہ تھا ــــــ

Scanned by TapScanner

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

تمھاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شررفشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

یہ نمونہ ہے بانگ درا کی ان غزلوں کا جو اقبال کی نئی منزل کا پتا دیتی ہیں۔ بال جبریل اقبال کے اردو کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں جو غزلیں شامل ہیں انھیں اقبال کے فکر و فن کی معراج کہنا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ یہ غزلیں اردو شاعری کے میدان میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بال جبریل کی غزلوں نے اردو غزل کی توانائی کا ثبوت فراہم کر دیا۔ کلیم الدین احمد نے غزل کے شعر پر یہ کہہ کے وار کیا ہے کہ "غزل کا شعر! دو مصرعے! دو مصرعوں کی بساط ہی کیا؟" مطلب یہ کہ دو مصرعوں میں کہا ہی کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے تو بہت پہلے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کون سی بات ہے جو دو مصرعوں میں ادا نہیں ہو سکتی۔ کبھی کبھی سمندر ایک بوند پانی میں سما جاتا ہے۔ اقبال نے پیچیدہ فلسفے اور مشکل پیغام کو پورے شعری آداب کے ساتھ غزل کے شعر میں پیش کر دکھایا۔

آئیے اب غزلِ اقبال کی خصوصیات کا جائزہ لیں ——

غزلِ اقبال کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا فکری عنصر ہے۔ اکثر ناقدین نے کہا ہے کہ شاعری کو فلسفہ و پیغام سے دور رہنا چاہیے۔ غزل کا فن تو اور بھی نازک ہے۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ غزل تو فکر کا بار بھی نہیں اٹھا سکتی۔ غالب نے اس سمت میں پہلا قدم اٹھایا اور اقبال نے تو ایک مکمل فلسفے کو غزل میں سمو کر کمالِ فن کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے قوم کو ادبار سے نکالنے کے لیے خودی کا فلسفہ وضع کیا جسے نظموں میں پیش کرنے کے علاوہ اشاروں اور کنایوں میں غزل میں بھی پیش کر دیا۔

اقبال نے خودی کو خودشناسی اور خودآگہی کے معنی میں استعمال کیا ہے اور اس کے استحکام کے لیے عشق، جہدِ عمل، فقر و رجائیت اور مردِ کامل کی پیروی کو ضروری قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جس کی خودی مستحکم ہو جائے وہ مردِ کامل ہو جاتا ہے۔ اس فلسفے کی وضاحت تو نظموں بالخصوص فارسی نظموں، اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں کی گئی ہے۔ لیکن غزل کے شعروں میں جا بجا اس کی طرف اشارے کیے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ——

Scanned by TapScanner

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

سفینۂ برگِ گل بنائے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

کہا گیا ہے کہ فکر سے فن کو آب و تاب ملتی ہے۔ اقبال کی غزل اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اقبال کی غزل کو جس خصوصیت نے لازوال اور بے مثال بنا دیا وہ یہی فکری عنصر ہے۔

کامیاب شاعر ایک کامیاب مصور بھی ہوتا ہے۔ مصور رنگ اور برش سے تصویر بناتا ہے شاعر لفظوں سے ایسی منہ بولتی تصویر بنا دیتا ہے کہ وہ رنگوں سے بنی ہوئی تصویر سے بازی لے جاتی ہے۔ اس فن میں اقبال کو جیسی مہارت حاصل ہے اس کی نظیر اردو تو کیا شاید بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی نہ مل سکے۔ ان کے کلیات کو ایک دلکش آرٹ گیلری کہا جائے تو بجا ہے۔

تصویر کشی کی کئی صورتیں ممکن ہیں: ساکت یعنی ٹھہری ہوئی تصویر۔ متحرک تصویر اس سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ تمثیل کا رتبہ اس سے بھی کچھ سوا ہے۔ تمثیل میں فن کار یہ طریقِ کار اختیار کرتا ہے کہ ایک سے زیادہ بے جان چیزوں کو جاندار فرض کر لیتا ہے۔ پھر ان کے عمل یا ان کی گفتگو کو کسی کہانی کی شکل دے دیتا ہے۔ تصویر کشی کی بلند ترین شکل یہ ہے کہ اس میں ڈرامائی شان پیدا ہو جائے۔ اقبال کی نظموں میں تو اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ لیکن غزل کے اشعار میں بھی جا بجا تصویریں نظر آتی ہیں۔ غزل چونکہ رمز و ایما کا فن ہے اس لیے یہ تصویریں مبہم اور دھندلی ہیں اور یہی پیکر تراشی کا کمال ہے۔

اور اب ملاحظہ ہوں چند تصویریں ——

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

Scanned by TapScanner

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصلِ بہاری! یہی ہے بادِ مراد!

*

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

*

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

موسیقی بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ موسیقی کے بغیر تو شاعری کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ غزل تو سراپا ترنم ہوتی ہے۔ وزن و بحر، قافیہ و ردیف سے غزل میں ترنم پیدا ہوتا ہے۔ اقبال کی غزل میں یہ خصوصیت خاص طور پر نمایاں ہے۔ اقبال کی طبیعت کو موسیقی سے گہری مناسبت تھی اور اس کے اسرار و رموز سے انھوں نے گہری واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ ایک عرصے تک ستار بجانے کی مشق بھی کی تھی۔

موسیقی دو طرح کی ہوتی ہے ـــ نیند لانے والی جیسے لوری اور دلوں میں جوش پیدا کرنے والی جیسے فوجی بینڈ۔ اقبال نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی خوابِ غفلت کا ایک سبب اس کی موسیقی بھی ہے یعنی نیند لانے والی موسیقی۔ انھوں نے دانستہ طور پر اپنی شاعری میں بلند آہنگ موسیقی کو اختیار کیا۔ دھیمے سُر اور نرم کیفیتوں سے جہاں تک ممکن ہو وہ گریز کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا لہجہ ایسا بلند آہنگ ہے کہ اس میں ندائے آسمانی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے کلامِ ربّانی کا مطالعہ بہت توجہ کے ساتھ کیا تھا۔

غزلِ اقبال کا ایک بہت بڑا وصف تسلسلِ خیال ہے۔ پراگندہ خیالی ان کے یہاں مفقود ہے۔ ان کا ایک خاص فلسفہ ہے، ایک خاص پیغام ہے جسے وہ اپنے مخاطبین تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس پیغام کے سوا اِدھر اُدھر کی باتیں ان کی غزل میں راہ نہیں پا سکتیں۔ اس لیے ان کی غزل ادھر ادھر نہیں بھٹکتی اپنے مرکزی خیال پر مضبوطی سے قدم جمائے رہتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اقبال کی غزل میں معنوی تسلسل اور وحدتِ تاثر کے جلوے نظر آتے ہیں اور ان کی ہر غزل میں ایک مخصوص مزاجی کیفیت نمایاں ہے۔ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" اور "اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا" کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

غزل کی اصل جولاں گاہ شاعر کی ذاتی واردات ہے لیکن اقبال ملّی و قومی مسائل کو غزل میں پیش کر رہے تھے اور ایک مقصدِ خاص پیشِ نظر رکھتے تھے اس لیے ان کی غزل اجتماعی مقاصد کی ترجمان بن گئی اور اس میں داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کا ہلکا سا رنگ بھی پیدا ہو گیا۔ گویا خارجیت بھی غزل اقبال کی ایک خصوصیت ہے۔

غزل کی زبان کے بارے میں یہ خیال عام رہا ہے کہ اس میں صرف نرم اور شیریں الفاظ کی گنجایش ہے، کھردرے اور ثقیل الفاظ اس میں نہیں کھپ سکتے۔ یہ رائے غلط ہے اور اقبال نے اپنی غزل سے اسے ثابت کر دکھایا۔ بھاری بھرکم الفاظ ان کی غزل میں بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ان کے ثقیل قوافی بھی قاری کو چونکاتے ہیں مثلاً: پاژند، خورسند؛ دقیق، عتیق؛ اعراف، کشاف وغیرہ۔ اس طرح کے الفاظ کا استعمال قدیم وضع کے اکثر لوگوں کو پسند نہیں آیا۔ لکھنؤ میں اقبال کی زبان سے غزل "کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں" سن کر پیارے صاحب رشید نے فرمایش کی تھی کہ اب اردو کی بھی کوئی غزل سنا دیجیے۔

استعارہ و تشبیہ سے بھی اقبال نے بہت کام لیا لیکن ان کی نوعیت ترصیعی کم اور توضیحی زیادہ ہے۔ مطلب یہ کہ وسائلِ شعری سے اقبال نے صراحت و وضاحت کا کام زیادہ لیا۔ صنائع بدایع بھی اقبال کی غزل میں بڑی تعداد میں موجود ہیں لیکن صنعت تلمیح سے انھوں نے خاص طور پر کام لیا۔ دیکھیے اس کی مثالیں ــــ

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں — کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

تلمیح کے پہلو بہ پہلو اقبال نے اختصار، ایجاز اور استعارے سے بھی کام لیا ہے اور یہ غزل کی ممتاز خصوصیات ہیں۔

ہم اس مختصر مضمون کو اقبال کے ایک پرستار کے اقتباس پر ختم کرتے ہیں:-

"اقبال کی غزل اردو شاعری میں ایک نئی آواز ہے ــــ فکر انگیز اور پُر تاثیر! اقبال، نے غزل کو قوم کی مسیحائی کے لیے استعمال کیا، پیغامبری کا ذریعہ بنایا مگر اس کی رعنائی و دلکشی میں کمی نہ آنے دی۔ سیاسی افکار، فلسفیانہ خیالات، سماجی رجحانات، ملّی و قومی

مسائل نے ان کی غزل میں جگہ پائی مگر غزل کے اہم اوصاف ـــــ رمزیت و اشاریت، ابہام، تخیل کی بلندی، احساس کی شدت، پیرایۂ بیان کی دل آویزی برقرار رہے بلکہ کچھ اور نکھر گئے۔ انھوں نے غزل کی شیرینی میں تندی و تیزی کی آمیزش کی یعنی نغمۂ جبریل اور بانگِ اسرافیل کو شیر و شکر کر دیا کیونکہ سوتوں کو جگانے اور مردوں کو زندہ کرنے کے لیے اسی کی ضرورت تھی۔ اردو غزل ناامیدیوں اور مایوسیوں کی آماج گاہ تھی۔ اقبال نے اسے امیدوں اور امنگوں کی جولان گاہ بنا دیا۔ غرض انھوں نے اردو غزل کی دنیا بدل دی اور اس کارنامے نے انھیں وہ مقام عطا کیا جو میر و غالب کے پہلو میں بلکہ بعض کے نزدیک اس سے بھی بلند ہے۔"

* *

Scanned by TapScanner